بجنگ آمد میں طنز و مزاح اور غالب شناسی

میمونہ ثاقب
ایم فل سکالر (اُردو)
ادارہ زبان و ادبیات اردو، جامعہ پنجاب، لاہور

COMICAL TRACES IN "BA JANG AAMAD" AND GHALIBYAAT

Memona Saqib
MPhil Scholar (Urdu)
IULL, Punjab University Oriental College, Lahore

Abstract

Colonel Muhammad Khan is a renowned comic writer of Urdu labguage. He got recognition in literary circles by his very first book namely BaJang Aamad. Basically, it is a travelogue which also carries comical tinges. Col. Khan creates humour in his writing by employing classical verses of Urdu and Persian. Especially, he uses verses of Mirza Ghalib beautifully as per the demand of the situation. The paper highlights Col. Khan's knack of creating humour by apt usage of verses especially that of Ghalib's.

Keywords:
طنز، مزاح، عربی، فارسی، مرزا غالب، کرنل محمد خان، بجنگ آمد، پشاور

مزاح عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہنسی، مذاق اور ٹھٹھا وغیرہ ہے۔ عربی ہی کا ایک قول ہے: المزاحُ فی الکلام کالملح فی الطعام گویا تحریر ہو یا گفت گو مزاح کا عنصر اتنا ہی ہونا چاہیے جتنا قابل برداشت ہو، تبھی اس کا حُسن قائم رہتا ہے۔ جہاں تک اردو نثر کا تعلق ہے اس کے شروع کے جدید دور کے ابتدائی نثر نگاروں میں مرزا غالب (۱۸۶۹ء) خود بھی بہت اچھے مزاح نگار تھے۔ ان کے خطوط میں طنز و مزاح کی خوب صورت چاشنی ملتی ہے۔ مرزا غالب کے خطوط میں علمی و ادبی حسن کے ساتھ ساتھ اُن کی ظرافتِ طبع بھی اپنا کام دکھاتی نظر آتی ہے۔ سقوط دلی کے بعد گو ان کے معاشی اور مجلسی حالات خاصے دگرگوں تھے، اس کے باوجود ان کی تحریروں کی شگفتگی اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ نواب انور الدولہ کے نام لکھے ہوئے ان کے ایک خط سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''کیوں کر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔ واہ کیا ہوش مندی ہے کہ قبلہ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم۔ سُن غالب! ہم تجھ سے کہتے ہیں بہت مصاحب نہ بن: اے ایاز، حدِ خود بشناس۔''(۱)

مزاح نگاری میں اگرچہ اور بھی بہت سے نام ہیں جن میں خاص طور پر فرحت اللہ بیگ (۱۹۴۷۔۱۸۸۵)، شفیق الرحمن (۲۰۰۰۔۱۹۲۰)، پطرس بخاری (۱۹۵۸۔۱۸۹۸) اور مشتاق یوسفی (۲۰۱۸۔۱۹۲۳) اہم ہیں۔ اسی طرح سفر نامہ نگاروں میں ضمیر جعفری (۱۹۹۹۔۱۹۱۶)، احمد ندیم قاسمی (۲۰۰۶۔۱۹۱۶)، مستنصر حسین تارڑ، عطاالحق قاسمی، ممتاز مفتی (۱۹۹۵۔۱۹۰۵) اور دیگر کے نام آتے ہیں۔ سفر ناموں میں طنز و مزاح بھی ایک اضافی خوبی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جیسے مستنصر حسین تارڑ اور عطاء الحق قاسمی وغیرہ۔ مستنصر کے سفر نامے سے ایک اقتباس دیکھیے:

> ''میں جو پہلے دبکا بیٹھا تھا۔ اب ٹانگیں پھیلا کر نشست پر نیم دراز ہو گیا اور سگریٹ سلگا کر مزے سے کش لگانے لگا۔ اگر کوئی شخص از راہِ نوازش لفٹ کی پیشکش کرے تو دورانِ سفر آپ کا رویہ اس بھلے آدمی کے ساتھ نہایت ہی عاجزانہ قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات پر ہاں میں ہاں ملانا اور تمام سوالوں کا جواب انکساری سے دینا آپ پر فرض ٹھہرتا ہے مگر یہاں تو معاملہ ہی اُلٹا تھا۔ اگر مجھ پر پٹرول کی قیمت ادا کرنا واجب قرار دیا گیا تھا تو پھر دھڑلے سے سفر کرنا بھی میرا حق بنتا تھا۔''(۲)

ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ سفر ناموں میں بسا اوقات مصنفین خواتین کو کہیں نہ کہیں ضرور جگہ دیتے ہیں۔ ایسا ہی اکثر و بیشتر جاسوسی ادب میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ نئے سفر نامہ نگاروں میں مستنصر حسین تارڑ اور عطاء الحق قاسمی کے ہاں یہ رویہ خاصا اہم ہے:

''میں نے ناژلا کی جانب دیکھا۔ وہ بدستور سلاخوں کے ساتھ چہرہ جمائے کھنڈر کے ابدی سکوت میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مڑ کر میری طرف دیکھا۔ 'یہ گلی بند ہے'۔''(۳)

اسی طرح شفیق الرحمن کی مزاح نگاری میں نسوانیت کا بھرپور ساتھ ہمیں دکھائی دیتا ہے:

''شاید اس میں ملغوبہ کا قصور نہیں تھا۔ مشرق میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ حسن و جمال رُخِ روشن تک ہی محدود ہے (جسم اور جُثہ کیسا بھی ہو)۔''(۴)

اس کے علاوہ سرسید کے مضامین میں طنز کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ طنز و مزاح لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ غالب و سرسید سے چلتا ہوا یہ سلسلہ فرحت اللہ بیگ، شفیق الرحمن اور پطرس بخاری جیسے بڑے لکھاریوں تک پہنچتا ہے۔ ان سب نے اپنے اپنے انداز میں اردو نثر کو مزاح کے حسین و جمیل رنگوں سے آشنا کیا۔ انھی خوب صورت رنگوں میں ایک رنگ کا نام کرنل محمد خان ہے جن کی پہلی کتاب ''بجنگ آمد'' کے نام سے ہمارے سامنے آئی۔

کرنل محمد خان پنجاب کے ضلع جہلم کے ایک گاؤں میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جہلم سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور آئے، لیکن اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر لیفٹیننٹ بننے کے شوق میں انگریزی فوج میں درخواست گزار ہو گئے۔ انٹرویو میں کامیابی کے بعد انھیں فوراً ہی انڈیا کے ایک دور دراز علاقے مہو میں ٹریننگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۔اگست ۱۹۴۰ء کا ہے۔ مہو میں ان کی سخت ٹریننگ کے بعد انھیں باقاعدہ چند ساتھیوں سمیت نائب لیفٹیننٹ کے تمغوں سے نوازا گیا اور حکم دیا گیا کہ اپنے ساتھیوں سمیت پشاور پہنچیں۔ محمد خان کی لاہور رہنے کی شدید خواہش دل ہی دل میں انگڑائی لے کر دم توڑ چکی تھی اور وہ اب ٹرین میں بیٹھے پشاور کی طرف رواں دواں تھے۔ پشاور میں زیادہ تر انگریز افسران تھے کیوں کہ کرنل صاحب کے بہ قول:

''دیسی افسروں کی تھوک بھرتی کسی قدر بعد میں شروع ہوئی۔'' (۵)

ایک دو دن وہاں انگریز افسروں کے ساتھ گزارنے کے بعد ان کے ایک سارجنٹ ایڈجوٹنٹ نے انھیں حکم دیا کہ وہ ایک دور دراز پہاڑی علاقے دتا خیل میں جا کر قبائلیوں کے ساتھ نبرد آزما ہو جائیں اور وہاں موجود انگریز افسر ٹام کو واپس پشاور بھیج دیں۔ یہاں پر کرنل محمد خان کے میس بوائے شیر باز کو جو ایک پٹھان تھا، سخت غصہ آیا۔ اس نے وعدہ بھی کیا کہ میں آپ کو وہاں نہیں جانے دوں گا۔ چناں چہ اس نے مرچ مصالحوں سے بھرپور تکے کباب کھلائے تاکہ وہ بیمار ہو جائیں۔ لیکن بہ قول کرنل صاحب پہلا تکہ کھا کر ہی انھیں اندازہ ہو گیا تھا، انھوں نے کھانے میں احتیاط کا دامن پکڑے رکھا اور ایک صبح دتا خیل سے نکل پڑے، وہاں پہنچ کر کچھ دن جنگ میں مصروف رہے۔ اس عرصے میں قبائلیوں سے بار بار لڑائیوں کی مشکلات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا اور اسی جنگ میں ان کے کئی ساتھی لقمۂ اجل بن گئے۔ انھوں نے یہاں نہ صرف قبائلیوں کے اچانک حملوں کے بارے میں لکھا ہے بل کہ انگریزوں کی طرف سے ان کی بستیاں تباہ کرنے کا احوال بھی بیان کیا ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ اتنے خوف ناک ماحول میں نہ صرف کرنل محمد خان بل کہ ان کے میس بوائے شیر باز بھی اتنے مگن ہو چکے تھے کہ پشاور واپسی کا حکم سُن کر نہ صرف دونوں ششدر رہ گئے بل کہ جب انھیں یہ پتا چلا کہ میران شاہ میں ان کی واپسی کے لیے ایک جہاز موجود ہے تو حیرت زدگی کے عالم میں ان کا یہ جملہ قابلِ غور ہے:

> ''حیران تھا کہ یااللہ ایک خستہ نیم لفٹین کے بغیر کون سے کام بند ہیں جو ہوائی جہاز سے بلایا جا رہا ہے۔ بہر حال دتا خیل کو ایک ارمان انگیز سی الوداع کہی اور پشاور پہنچتے ہی ایڈجوٹنٹ صاحب کے حضور پیش ہوا۔''(۶)

جس طرح غالب کے ایک مصرعہ ''غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں'' کو اشاراتی طور پر یہاں استعمال میں لایا گیا ہے، بالکل اسی طرح ابن انشاء نے بھی اپنے ایک سفر نامہ ''چلتے ہو تو چین کو چلیے'' میں بڑے لطیف پیرائے میں غالب ہی کے ایک مصرعے کو اشاراتی لہجے میں بیان کیا ہے:

> ''پہلے ہی روز ہم پیکنگ کی سڑکوں پر نکلے تو کیا دیکھا کہ اسکول کے لڑکوں کے غول کے غول ٹہنیاں، پودے، قلمیں اور پیڑ ہاتھوں میں اُٹھائے شجر کاری میں مصروف ہیں ..... ہمیں وہ دن یاد آ گئے جب پرائمری کی جماعتوں میں پڑھتے ہوئے ہماری پوری کلاس کھیتوں میں نکل جاتی تھی اور دو دو میل تک پوہلی کاٹتی چلی جاتی تھی۔ اس عالم میں نہ دھوپ کا خیال ہوتا تھا نہ کسی صلے کی پروا۔''(۷)

پشاور پہنچنے پر ایک اور دھماکا خیز حکم نامہ ان کا منتظر تھا یعنی انھیں سمندر پار بھیجا جا رہا تھا۔ شیر باز نے جو اس سارے سفر میں ان کا خاص رفیق کار رہا تھا، یہاں تو ان کو روکنے کے لیے حد ہی کر دی یعنی انتہائی مصالحہ خیز کباب اور اس کے علاوہ بہت سے بزرگوں عاملوں سے دعائیں اور کئی تعویذ گنڈے بھی لا لا کر دیے لیکن یہ سب کار گر ثابت نہ ہو سکے اور کرنل صاحب تیسرے ہی دن ریل گاڑی میں بیٹھے بمبئی کی طرف رواں دواں تھے۔ یہاں سے ان کے بحری سفر کا آغاز ہوا۔ اس بحری جہاز میں بصرہ تک پہنچتے ہوئے انھیں سات دن لگ گئے۔ چناں چہ یکم ستمبر ۱۹۴۱ء کی صبح کو یہ جہاز بصرہ کے ساحلوں پر جالگا۔ بصرہ کے لق ودق صحرا میں ان کی منزل شائبہ کیمپ تھی جہاں دور دور تک سبزے کا نام ونشان تک نہ تھا۔ کرنل صاحب بتاتے ہیں کہ یہ ایک انوکھا تجربہ تھا کیوں کہ ہم نے اس سے پہلے کبھی ایسا اصلی ریگستان نہ دیکھا تھا۔ ان کے یہ جملے بھی لائق تحسین ہیں:

> ''خود بصرہ تو دجلہ کی گزرگاہ کے طفیل بہت سرسبز وشاداب تھا اور کھجوروں کے درخت تو وہاں انسانوں سے بھی زیادہ تھے، لیکن بصرے سے باہر نکلنا تھا کہ سبزہ یک قلم غائب ہو گیا اور انسان بھی تقریباً غائب۔ حد نگاہ تک لق ودق اور ہم وار ریگ زار تھا جس میں کسی عمودی شے کا وجود تک نہ تھا۔'' (۸)

اگرچہ فوجی زندگی کا مطلب ہی اپنے اوپر سختیاں برداشت کرنا ہوتا ہے لیکن اجاڑ اور لق ودق صحرا سے انسان کہاں تک نبرد آزما رہے۔ اُکتاہٹ کا شکار ہو جانا لازمی امر ہے۔ لہٰذا بہ قول کرنل محمد خان یہاں ہر کسی کی خواہش ہوتی تھی کہ اتنے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ بغداد شہر کا ایک چکر ضرور لگا آئے۔ انھوں نے مزاحیہ انداز میں کہا ہے کہ اگر بغداد جانے کا کوئی سرکاری کام نکل بھی آتا تو بیسیوں افسر اپنی خدمات پیش کر دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدمات تو ہم بھی پیش کرتے لیکن ہمیشہ اکیسویں رضاکار ہی رہتے۔ پھر ایک بار انھیں یہ موقع میسر آ گیا۔ چناں چہ انھوں نے بغداد شہر کے حسین وجمیل نظاروں، وہاں کے ہوٹلوں اور اُن ہوٹلوں میں برپا ہونے والی شام کی رنگین محفلوں کو بڑے ہی اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے۔ وہاں رات کی رنگین محفلوں جن میں شراب وکباب کے ساتھ ساتھ ان حسین دوشیزاؤں کا تذکرہ بھی ہے جو نیم عریاں حالت میں ان بڑے بڑے ہوٹلوں میں رقص کرتی نظر آتی تھیں۔ اپنے متعلق انھوں نے خود لکھا ہے کہ ہمیں اللہ نے محفوظ تو رکھا لیکن دیکھنے والوں میں ہم

بہ ہر حال شامل رہے۔ یہ ان کی ادبی دیانت داری کا ثبوت ہے ورنہ اکثر مصنفین اپنے آپ کو یہاں ملک پار سا کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسان کسی بھی حال میں یکسانیت کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ لہٰذا کرنل محمد خان بھی اس بہ ظاہر رنگین دنیا سے اُکتا گئے تو اپنے ایک ساتھی لیفٹیننٹ (جسے انھوں نے نیم لفٹین لکھا ہے) سے کربلا اور نجف جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ بھی راضی ہو گئے۔ اپنے اس سفر کو بھی انھوں نے اپنے خاص طنز و مزاح کے خوب صورت لباس میں سجا کر پیش کیا ہے۔ ان لفٹین صاحب کی غلطیوں اور عجیب و غریب حرکات کا بہت ہی اچھوتے انداز میں احاطہ کیا ہے۔ فوجی وردیوں میں ان دونوں لفٹینوں کے پیچھے بچوں کی ایک پلٹن لگی ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں کہ جب امام حسین کے روضہ مبارک میں داخل ہوئے تب جا کر ان لونڈوں سے نجات ملی۔ لفٹین صاحب کی حرکات سے تنگ آ کر مصنف نے اگلے دن ان کے ساتھ کاظمین جانے سے معذرت کر لی اور اکیلے ہی کاظمین جا پہنچے۔ کہتے ہیں کہ وہاں اُترتے ہی ایک مجمع دیکھا جس میں دو آدمی گتھم گتھا تھے۔ کرنل صاحب کے مطابق ان میں سے ایک ہمارے کل والے لفٹین صاحب ہی تھے۔

انھی دنوں جرمن فوج کے مشہور جنرل رومل نے طبرق پر حملہ کر دیا تھا اور کرنل صاحب کے لشکر کو یہاں سے کوچ کرنے کا حکم ملا۔ وہ پندرہ سو میل کا یہ سفر اپنے کارواں کے ساتھ طے کرنے لگے۔ یہ قافلہ دن کے وقت سفر کرتا اور رات کو کہیں آرام کرتا۔ ان کی پہلی منزل مجورہ تھی۔ مجورہ سے حیفہ، مرسیٰ، مطروع اور یہاں سے سلوم جا پہنچے۔ سلوم مصر اور لیبیا کی سرحد کے قریب ہی واقع ہے۔ لکھتے ہیں کہ رات وہیں جنگ کی طرف پیٹھ کر کے بحیرۂ روم کے کنارے گزاری اور صبح درئہ خلفایہ سے گزر کر طبرق سے چند میل ادھر ہل حمد کے مقام پر فروکش ہوئے۔ یہاں پر انھوں نے جنگ کا پوری طرح نقشہ کھینچا ہے کیوں کہ ان کے قریب ہی توپوں کی گھن گرج جاری تھی۔ پہلے سے موجود فوج جرمن سپاہیوں سے لڑ بھی رہی تھی۔ پھر اس رات ان کی بر گیڈ نے جرمن فوجیوں پر خفیہ حملہ کیا اور ان کے چند ساتھیوں کو قیدی بنا کر لے آئے۔ لیکن اگلی ہی صبح جرمن نے ان کی بر گیڈ پر بھرپور حملہ کر کے بم باری شروع کر دی۔

اب انھیں پسپائی کا حکم دے دیا گیا۔ چناں چہ ان کی بر گیڈ پیچھے کو دوڑ پڑی۔ یہاں پر اہم فوجی راز یہ بتایا گیا ہے کہ پسپائی کا مطلب ایک نہایت دقیق جنگی چال ہے یعنی کسی کونے سے دشمن پر شدید

گولہ باری شروع کر دی جاتی ہے اور اسی دوران دوسری طرف سے اپنے خیموں کو سمیٹنے اور لپیٹنے کا آغاز کر دیا جاتا ہے لیکن جوں ہی دو چار پہلی لاریوں کا قافلہ سلوم پہنچا تو اگلی صبح پتا چلا کہ جرمنوں نے باقی تمام فوجیوں کو مار ڈالا ہے۔ وہاں سے واپسی پر یہ مرسیٰ مطروع پہنچے جو مصنف کے بہ قول پہلے تو بڑا سرسبز و شاداب لگ رہا تھا لیکن اب ہر لمحے یہاں حملے کا خطرہ تھا۔ قافلہ مرسیٰ مطروع سے العالمین اور پھر العالمین سے قاہرہ آ پہنچا۔ قاہرہ میں مینا کیمپ بھی شائبہ کیمپ کی طرح ایک چھوٹا سا شہر ہی تھا۔ یہاں ہندوستانی افسروں کی بھی خاصی تعداد تھی اور کھانے پینے کی بھی وافر مقدار تھی۔ ایسا اچھا انتظام پشاوری کیمپ میں بھی نہ تھا۔ قاہرہ رہتے ہوئے انھوں نے چند دن آرام و سکون کے ساتھ گزارے۔ قاہرہ میں انھوں نے ابوالہول اور اہرامِ مصر بھی دیکھے اور وہاں کی رنگین راتیں بھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ قاہرہ کے بازاروں میں زنانہ اور مردانہ فوجیوں کی اتنی بڑی تعداد پھر رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنگ صحرائے لیبیا میں نہیں، قاہرہ کے بازاروں میں لڑی جا رہی ہے۔ اب وہ قاہرہ کی دل چسپ اور رنگین زندگی میں آرام سے رہ رہے تھے، جہاں فوجیوں کو اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ قاہرہ میں ان کے کیمپ کا نام عباسیہ کیمپ تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل پیٹرسن کمان آفیسر تھے۔ یہاں کے کچھ خوش کن واقعات بھی انھوں نے بڑی مہارت کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہاں پر جلالتہ الملک (شاہ فاروق) سے ان کی ملاقات بھی ہوئی۔

ان دنوں قاہرہ میں میلاد النبی ﷺ کا تہوار بڑی عقیدت و احترام اور جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ خود شاہ فاروق تقریبات میں حصہ لیتے تھے۔ یہاں عباسیہ کیمپ سے المازہ کیمپ کی طرف رُخ ہوا۔ کہاں بہت پُر آسائش زندگی کے دن اور کہاں پھر اس قدر مشکلات کہ پانی کی ایک ایک چھوٹی سی بوتل ۲۴ گھنٹوں میں ملتی۔ کہاں قاہرہ و بغداد کے حسین و جمیل دن اور ناچتی، تھرکتی اور گاتی راتیں اور کہاں پر سلوم کی خوف ناک پس پائی۔ یعنی صحرا کی اس لڑائی اور عباسیہ کی مار کٹائی کا مختلف انداز میں نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہیں سے وہ واپس برما بھیج دیے گئے۔ اسی اثنا میں پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ برما ڈیڑھ سال قیام کے بعد وہ پاکستان آ گئے اور انھوں نے لکھا ہے کہ خوف ناک جنگ کے اس ماحول میں ہمیں کوئی خراش بھی نہ آئی تھی اور یہ اللہ کا بڑا کرم تھا۔ پاکستان آنے کے بعد ایک اور زنجیر ان کے انتظار میں تھی۔ وہی جن کا غالب نے بھی ذکر کیا ہے یعنی اب وہ اکیلے نہیں رہے تھے بل کہ باقاعدہ ایک خاتون کے شوہر بن چکے تھے۔

کرنل محمد خان کی یہ کتاب ان کے حُسنِ تحریر کا ایک خوب صورت شاہ کار ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر لیفٹیننٹ بھرتی ہونے کے بعد قبائلیوں سے جنگ، ازاں بعد دجلہ و فرات کے کنارے بغداد اور یونان کی سرحدوں تک جا کر لڑنا اور آخر کار قاہرہ کے حسین و جمیل نظاروں میں دن گزارتے ہوئے برما پہنچنا اور وہاں سے نئی مملکتِ خداداد پاکستان میں آمد تک کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ ان کا انداز نہایت دل کش اور طرزِ تحریر بے حد شگفتہ ہے۔ معمولی سی بات کو ایسے پُرتاثیر پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ قاری داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسے بادی النظر میں ایک جنگی سفر نامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ مزاح کی شگفتگی کے ساتھ ساتھ طنز کی ہلکی پھلکی کاٹ سے مزّین بھی ہے۔ تاہم مصنف نے کوشش کی ہے کہ کوئی ایسا جملہ نہ لکھا جائے جس سے کسی درجۂ چہارم کے ملازم حتیٰ کہ خاک روب تک کے پیشے کی توہین ہو۔ گویا انھوں نے اپنے مزاح میں بھی انسانی احترام کا خاص خیال رکھا ہے۔

کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے فارسی اور اردو شاعری کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے کیوں کہ وہ اپنی تحریر کو قدم قدم پر مرزا غالب اور اقبال کے مصرعوں سے مزّین کرتے چلے جاتے ہیں اور ان کا ایسا بر موقع اور بر محل استعمال کرتے ہیں کہ اردو کی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی نظیر ہو۔ دیوان غالب کے نثری استعمال کی ایسی عمدہ مثالیں اردو ادب میں کم ہی ہوں گی، مثلاً گیارہ میں خیمہ زن فوجیوں کو خوراک میں محض بیف کا ایک ڈبہ اور پانی کی ایک بوتل ۲۴ گھنٹوں میں ملتی ہے۔ وہاں شکار کی تعداد بہت زیادہ تھی کہ کرنل صاحب کے بہ قول آپ نے اُسے تلاش نہیں کرنا بس بندوق اُٹھا کر کیمپ سے باہر نکلنے کی تکلیف گوارا کرنی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ امیر خسرو کہیں سے آواز دے رہے ہیں:

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف
بہ اُمید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد(۹)

ان کا طرزِ تحریر اگرچہ ماضی کے تمام مزاح نگاروں سے ہٹ کر ہے، وہ امن اور جنگ ہر طرح کے ماحول میں قاری کو اپنے ساتھ ساتھ رکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا اندازِ تحریر بھی سب سے جُداگانہ ہے۔ تاہم ایک آدھ مقام ایسا بھی آ جاتا ہے جہاں وہ ماضی کے کسی مزاح نگار سے متاثر نظر آتے ہیں، مثلاً یہ جملے ملاحظہ کریں:

''اس کے بعد ہر روز سرِ شام پہاڑ کے کسی کونے سے مصرع طرح کے طور پر ایک قبائلی گولی آنکلتی اور یہ شعر گوئی اس وقت تک جاری رہتی جب تک جواب میں ایک پوری غزل پیش نہ کر دی جاتی۔'' (۱۰)

ان جملوں کو پڑھ کر پطرس بخاری کا مشہور مضمون 'کتے' ذہن میں گھوم جاتا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے:

''رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو اس نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا، فوراً حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف ایک قدر شناس کتے نے زوروں کی داد دی۔'' (۱۱)

منظر کشی کی ایسی ہی مثال مستنصر حسین تارڑ کے ہاں بھی موجود ہے۔ لکھتے ہیں:

''گدھے کبھی بھی کتوں کی مانند کورس میں نہیں گاتے بل کہ وہ انفرادی گائیکی پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر ایک گدھا راکاپوشی کے گلیشئر کے قریب کھڑا ہے اور یک دم وہ رومانوی ہو کر اپنی کسی فیورٹ گدھی کی یاد میں تھوتھنی اُٹھا کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا شروع کر دیتا ہے تو بقیہ گدھے جو پورے بیس کیمپ کے طول و عرض میں خرمستیاں کر رہے ہیں وہ نہایت تحمل سے اس برادر کی آہ وزاری سُنیں گے۔''(۱۲)

کرنل محمد خاں کے ہاں خالص اردو زبان کا رچاؤ، محاورات اور روز مروں کا بر محل استعمال، جملوں میں روانی، تحریر میں شائستگی اور شُستگی، لہجے میں ملائمت اور حسنِ تاثیر کا اعلیٰ معیار صاف صاف نظر آتے ہیں۔ اپنے سفر نامے میں تمام مناظر کو ان کی ہیئت کے لحاظ سے بیان کرنا ان کا خاص انداز ہے۔ منظر کشی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''لیکن اس جائزے میں جھیل کے سوا کچھ پلے نہ پڑا۔ جدھر دیکھو جھیل ہی جھیل۔ یہ باور کرنے کے لیے کہ زمین پر کھڑے ہیں سینۂ خاک کو پاؤں سے دبانا پڑتا تھا۔ ورنہ چلتے چلتے بھی یہ احساس ہوتا کہ تیر رہے ہیں۔ جھیل کے گہرے پانی میں ایک ہیبت ناک سی کشش تھی اور بے اختیار اس میں کود پڑنے کو جی چاہتا تھا۔''(۱۳)

وہ اپنی تحریر میں اقبال کے مصرعوں سے بھی خوب استفادہ کرتے ہیں لیکن ان کی کتاب کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب کے دیوان کا تو گوشہ گوشہ انھوں نے کھنگال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اپنی طرف سے جملہ بازی کی بجائے وہ غالب سے ہی استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً غالب کا مصرع ہے:

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں

کرنل محمد خان لکھتے ہیں:

''پانچویں روز اچانک ایک دریا نے ہمارا راستہ کاٹا... حدِ نگاہ تک ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ معاً ہماری نگاہ ایک پکنک کرتی ہوئی ٹولی پر پڑی۔ انھوں نے ہمارا کانوائے دیکھا تو ہماری طرف لپکیں، ایک نہیں دو نہیں پوری سات دوشیزائیں! خدا جانے ان بنات النعش کے جی میں کیا آئی کہ دن دیہاڑے عریاں ہو گئیں یعنی تقریباً عریاں۔''(۱۴)

اسی پیرائے کو کرنل صاحب نے غالب کی غزل سے کس طرح سجا دیا ہے۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں:

''پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی! ہمیں دیکھ کر تو خیر انھیں کیا حاصل ہونا تھا، لیکن ہم سکتے میں آ گئے۔ ہمارا کارواں تو کیا، گردشِ شام و سحر رُک گئی۔ ساتوں کی سات سرو قد، آہو چشم اور مرمریں بدن۔ اس قدر دل ربا جیسے غالب کی غزل۔ اسے دیکھو تو زُلف سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے۔ اُسے دیکھو تو سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے اور وہ جو ذرا ہٹ کر مسکرا رہی تھی، چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے اور ہم کہ مُدت ہوئی تھی یار کو مہماں کیے ہوئے۔ جگرِ لخت لخت سے دعوتِ مژگاں کرتے آگے بڑھے۔''(۱۵)

مرزا غالب کی غزل کے وہ اشعار جن کو کرنل صاحب نے بڑی ماہرانہ عمدگی سے اپنی داستان کا حصہ بنایا ہے، یوں ہے:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے(۱۶)

گویا کرنل محمد خان کی یہ کتاب فکر و فہم، نثر کی تازگی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ادب میں اپنی مثال آپ ہے اور اردو زبان میں ایک نہایت ہی ان مول سرمایہ ہے۔ اسی لیے ان کے بارے میں سید عابد علی عابد کہتے ہیں:

''انھوں نے مزاحیہ ادب کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔ ایک نئی نہج سے آشنا کیا ہے۔ وہ اپنی تحریر کے موئسس اور خاتم نظر آتے ہیں۔ ان سے اکثر لوگ اثر پذیر ہوں گے لیکن وہ خود آزاد کی طرح ناقابلِ تقلید ہوں گے۔'' (۱۷)

آخر میں انھی کی کتاب سے ایک نثر پارہ حوالے کے طور پر پیش ہے، جس سے ان کی قادر الکلامی اور بذلہ سنجی کا واضح اظہار ہوتا ہے:

''عربی گو درساً نہیں پڑھی تھی تاہم باقی مسلمانوں کی طرح (یعنی ٹیڈی مسلمانوں کو چھوڑ کر) عربی پڑھنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور عربی لکھنا ہمارے دائیں ہاتھ کا اور دونوں ہاتھوں سے کوشش کر کے کچھ مطلب بھی نکال سکتے تھے؛ چناں چہ پہلے روز ہی جب عربی کتاب فر فر پڑھ ڈالی، تو بر گیڈیئر صاحب حیران رہ گئے اور استادِ محترم تو بھڑک ہی اُٹھے۔ جب اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ ہماری عربی دانی کی وجہ ہماری مسلمانی ہے، تو آپ نے خوش ہو کر حلق کی گہرائی سے ایک بل کھاتی ہوئی الحمد للہ نکالی۔ جواباً ہم نے بھی یرحمک اللہ پیش کی جو اپنے وطن میں تو چھینک مارنے کے سلسلے میں استعمال ہوتی ہے لیکن اس موقع پر بھی خاصی صفائی سے چپک گئی۔ احتیاطاً ہم نے ایک ہلکی سی مصنوعی چھینک بھی چھینک دی کہ ان مقدس تراکیب کے ٹیکنکل استعمال کی صحت بھی برقرار رہے۔'' (۱۸)

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) خلیق انجم (مرتب)۔ غالب کے خطوط (جلد دوم)، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۹۸۱

(۲) مستنصر حسین تارڑ۔ اندلس میں اجنبی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۶۳

(۳) ایضاً، ص ۱۸۴

(۴) شفیق الرحمن، دجلہ، ماورا پبلشرز، لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۸۱

(۵) محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، خورشید پرنٹرز، اسلام آباد ۱۹۷۹ء، ص ۴۲

(۶) ایضاً، ص ۵۷

(۷) محمد شاہد (مرتب)، یادگار سفر نامہ، علم دوست پبلی کیشنز لاہور، س ن، ص ۲۰۶

(۸) محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، ص ۶۸

(۹) ایضاً، ص ۹۲

(۱۰) ایضاً، ص ۵۵

(۱۱) پطرس بخاری، پطرس کے مضامین، بیکن بکس لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۸

(۱۲) مستنصر حسین تارڑ، راکاپوشی نگر، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۸

(۱۳) محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۷۲

(۱۴) محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، خورشید پرنٹرز، اسلام آباد ۱۹۷۹ء، ص ۱۱۵

(۱۵) ایضاً، ص ۱۱۱۶

(۱۶) غالب اسد اللہ خان، مرزا۔ دیوانِ غالب، مکتبہ جمال، لاہور ۲۰۰۴ء، ص ۳۹۴

(۱۷) محمد خان، کرنل، بجنگ آمد، فلیپ

(۱۸) ایضاً، ص ۱۰۱